ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

"آتے دنوں میں گم" ـــــــ تعارف و تجزیہ

"AATAY DINO MAIN GUM" _____
AN INTRODUCTION AND ANALYSIS

* ڈاکٹر عبدالرحیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور
**رانا حسین ناہر خاں
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور
***محسن نواز بسراء
پی ایچ۔ڈی اردو (سکالر)، جی۔سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
Dr. Zahid Munir Amir being a well-known researcher, stylistic poet and modern critic occupies a dignified place in literary circles. High ranked and impact factor literary journals always ready to publish master pieces created by the author good self. Three collections of his poetry have been published and welcomed in literary circles. "آتے دنوں میں گم" is a title of his book of free verse. In this article researcher has explored the poetic style of Dr. Zahid Munir Amir where his vision has been highlighted regarding anthropology and trends.

Keywords: Dr. Zahid Munir Amir, Free Verse, Creative Process, Classical Tradition, Romanticism, A Sensitive Poet.

کلیدی الفاظ: ڈاکٹر زاہد منیر عامر، آزاد نظم، تخلیقی عمل، کلاسیکی روایت، رومانویت، حساس شاعر۔

"آتے دنوں میں گم" ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ کتاب کا عنوان اپنے بیٹے سروش کے نام سے لکھی ہوئی نظم کے مصرعۂ ثانی سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب بھی "آتے دنوں کے نام" معنون ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ حصہ اوّل اور دوم میں بیس بیس جب کہ حصہ سوم میں دس منظومات کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ "پیشِ سخن" کے عنوان سے ڈاکٹر خورشید رضوی نے کتاب میں شامل نظموں کا بھرپور اور خوب صورت تبصرہ زیبِ قرطاس کیا ہے۔ "باتیں کرتی نظمیں" کے نام سے امجد اسلام امجد نے ان کے دل کش اور منفرد رنگ و آہنگ کو اُجاگر کرنے کے ساتھ اُن کے خوب صورت نمونے بھی دیئے ہیں۔ "عرضِ شاعر" میں مصنف نے جہاں کتاب کا جواز پیش کیا ہے وہاں نئے مجموعہ کلام کے منصہ شہود پر آنے کا جاں بخش مژدہ بھی سنایا ہے۔ مزید برآں اس کتاب پر تبصرہ کرنے والوں کے لیے حرفِ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

سپاس بھی اس کا حصہ ہے۔ شاعری کے بعد ''اختتامیہ'' کے عنوان سے ایک الگ حصہ ان تبصرہ نگاروں کی تحریروں کے لیے مختص ہے جنھوں نے قدرے باریک بینی اور عرق ریزی سے اس کتاب کا جائزہ لیا ہے۔ جمیل یوسف کا تبصرہ ''خزاں کی یخ بستگی میں پھولوں کی مسکراہٹ'' کے عنوان سے کتاب کا حصہ ہے۔ جمیل یوسف نے جتنی تفصیل سے کتاب کا جائزہ لیا ہے وہ اپنی جگہ لائق تحسین تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے نظموں کی معنویت کو تفہیم کی نئی راہوں سے آشنا بھی کیا ہے۔ جیسے جیسے ہم اس کو پڑھتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے شاعرانہ تخیل اور اس کا ارتقاء نئی منزلوں کی جانب قارئین کی راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دیتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے ''معانی کے پریدہ پرندے اور خوش ادا لفظوں کی ڈوریاں'' کے نام سے تبصرہ میں تصوف، فلسفہ، لسانی ساختوں، اقبال شناسی، گلوبلائزیشن اور فطرت کے تناظر میں منظومات کا جائزہ پیش کر کے اس کی معنویت کے مزید امکانات دریافت کیے ہیں۔ جمیل یوسف اور ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے تبصروں میں چار ایسی نظموں کا ذکر کیا ہے جو کتاب کے دوسرے حصے میں ہونی چاہئے تھیں کیوں کہ ان کے عنوانات اسی حصے سے لگا کھاتے ہیں۔ مثلاً نہیں ایسا نہیں کہتے، ترا عکس آئینوں میں، نظم تم سے کلام کرتی ہے، ابھی تو بھولے نہیں تھے وہ دن۔ واثق امکان یہی ہے کہ جب مسودہ تبصرے کے لیے بھیجا گیا تب متذکرہ نظمیں اس میں شامل تھیں لیکن اس کے بعد انہیں نئے مجموعے کے لیے الگ لیا گیا جیسا کہ عرضِ شعر میں مصنف نے بیان کیا ہے۔ کتاب کے بیک فلیپ پر افتخار عارف کا تبصرہ جہاں مختصر ہے وہاں خوب صورت اور دل کش انداز بھی لیے ہوئے ہے۔ وہ کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> ''مشرق کی کلاسیکی تخلیقی روایت سے آگاہی اور زبان و بیان کے تمام رنگ و آہنگ نمایاں کرنے کا ہنر انھیں بخوبی آتا ہے۔۔۔۔ زاہد منیر عامر کی نظمیں ہماری عصری شاعری کے منظر نامے میں اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کریں گی، مجھے اس کا یقین ہے۔'' [1]

پنجاب پبلک سروس کمیشن لاہور میں ایک انٹرویو کے دوران چیئرمین نے مجھ سے سوال کیا کہ غالب کو اپنی شاعری سے زیادہ اپنے آباؤاجداد کے پیشہ ''سپہ گری'' پر ناز تھا (لیکن یہ الگ بات ہے کہ غالب کو زندہ اُس کی شاعری نے ہی رکھا ہے) تو آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟ میں نے وہاں یہ موقف اختیار کیا کہ ہر شخص اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے مختلف انداز (میڈیم) اختیار کرتا ہے۔ کوئی کینوس پر رنگ بکھیر کر مصوری کرتا ہے، کوئی خطاطی کرتا ہے، کوئی ڈرامے ترتیب دیتا ہے، کوئی افسانے لکھتا ہے، کسی نے خاکہ نگاری کو اپنایا ہے اور کسی نے اپنے اظہار کے لیے شاعری کا سہارا لیا ہے، میں بھی اپنے تخیلات کے اظہار کے لیے شعر کہتا ہوں۔ مزید برآں میرے ایک سینئر دوست جو لاہور کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی سکالر ہیں انھوں نے کہیں استفسار کیا کہ میں کیسے شعر کہہ سکتا ہوں؟ میں نے ان سے کہا کہ پرواز جہاز کی ہو یا تخیل کی اُس کے لیے ایک دھچکا لگنا ضروری ہے اگر آپ عمر کے اس حصے میں کوئی دھچکا برداشت کرنے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں تو شعر کہنا مشکل نہیں۔ کبھی کبھی اکثر خیال آتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش و خرد عطا کیا ہے لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ اربوں، کروڑوں انسانوں میں فنونِ لطیفہ سے لگاؤ رکھنے والے افراد بہت کم ہی ہوتے ہیں؟ سعود عثمانی نے یہ بات درست طور پر کہی تھی کہ:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

میاں! یہ عشق ہے اور آگ کی قبیل سے ہے
کسی کو خاک بنا دے، کسی کو زر کر دے [۲]

کسی سے لگاؤ کبھی انسان کو ایک ڈھیری راکھ کی صورت تباہ و برباد کر دیتا ہے تو کبھی کسی کو اپنی کٹھالی میں جلا کر کندن بنا دیتا ہے۔اسی تخلیقی عمل کے کسی پہلو پر بات کرتے ہوئے فیضؔ نے اپنی نظم ''رقیب سے!'' میں ایسی ہی کسی بات کا اظہار کیا ہے:

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے، کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دُکھ درد کے معنی سیکھے

زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اَشک آنکھوں میں بِلکتے ہُوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عُقاب
بازو تولے ہُوئے، منڈلاتے ہُوئے آتے ہیں

جب کبھی بِکتا ہے بازار میں مزدُور کا گوشت
شاہراؤں پہ غریبوں کا لہُو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابُو ہی نہیں رہتا ہے [۳]

انسان جب کسی صدمے یا حادثے کے نتیجے میں عرفانِ ذات سے آشنا ہوتا ہے تو اس پر وجدان و ایقان کے در بھی وا ہو جاتے ہیں۔وہ اُنھی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے کہ مصداق غمِ ذات سے غمِ جہاں کی منزلیں طے کرتا ہوا نئے جہانوں کی دریافت کرتا ہے۔بقول شاعر:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

؎ غمِ جہاں میں تیرا غم بدلنے والا ہے
یہ آفتاب چراغوں میں ڈھلنے والا ہے ۴

غمِ جاناں کو غمِ دوراں سے ہم کنار کرنے کے لیے کون سے اسباب اور عناصر درکار ہیں؟اِس پر وزیر آغا ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''تخلیقی عمل وجود کی زنجیروں اور حد بندیوں کو توڑ کر از سرِ نو جنم لینے کا عمل ہے۔جب زندگی کسی اُپج یا تازگی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ایک بنے بنائے راستے کی گہری لکیروں میں مقید ہو کر ایک فرسودہ اور پامال اسلوب میں ڈھل جاتی ہے تو یہ گویا اس کی تدریجی موت کا اعلان ہے۔ایسے میں خود وجود کے اندر ایک بے قرار مستی ہمکنے لگتی ہے اور پھر اپنے خول کو توڑ کر باہر آتی اور اپنے اس عمل سے موت کو شکست دے ڈالتی ہے۔انسانی معاشرہ وجود کی اس حالت کے مشابہ ہے جو پامال اور پٹی ہوئی ہے جبکہ اس کے اندر پیدا ہونے والا فرد ایک ایسا پیکر ہے جو اپنی تخلیقی جست کی مدد سے معاشرے کی حدود و قیود کو عبور کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔'' ۵

انسان زندگی میں جب بھی کبھی غم سے آشنا ہوتا ہے تو اس کی حساسیت، مظاہر فطرت، انسانی رویوں سے اخذ و قبول کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتی ہے جس کے نتیجے میں وہ نہ صرف لوگوں کے دل کا حال بیان کرنے کی قدرت حاصل کرتا ہے بل کہ اس کی ہڈ بیتی، جگ بیتی کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے یہاں تک کہ اس کی خود کلامی اور انکشافِ ذات لوگوں میں مقبولیت کا مقام حاصل کرنے لگتا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے کی بیس نظموں کا جائزہ لیں تو اُن کا بھرپور تاثر یہی بات سامنے لاتا ہے کہ ایک حساس شاعر اپنے ماحول اور اُن سے منسلک اشیا، افراد، مظاہرۂ فطرت یہاں تک کہ افراد کے رویوں سے نہ صرف متاثر ہے بل کہ اُن سے نتائج کشید کر کے قارئین کو اپنی ژرف نگاہی اور قادر الکلامی سے جہاں ورطۂ حیرت میں مبتلا کرتا ہے وہاں علم و آگہی کی رَو انھیں حیرت و مسرت سے دوچار بھی کرتی ہے۔کہیں کہیں وہ نظمیں قارئین سے زیادہ توجہ کی متقاضی بھی ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ایک دو قرات سے اپنی معنویت کو منکشف نہیں ہونے دیتی۔کتاب کی اولین نظم ''قاہرہ کی پہلی نظم'' سے عام تاثر یہی ملتا ہے کہ قاہرہ کے مناظر فطرت، اس کے افراد اور وہاں سے حاصل ہونے والے نتائج کی حامل ہو گی لیکن اس کے سب ٹائٹل ''اُسارئ بدر کے فیصلے کا ایک لمحہ'' پہلی بات سے الگ تھلگ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔اس میں نبیؐ کی آمد، نبوت کا اعلان، حرمِ کعبہ سے غارِ حرا میں عبادت و ریاضت، بطحا کے دن، نبوت کے آشک، حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ، ابوالعاصؓ، فدیہ وغیرہ بالکل مختلف انداز میں سوچنے پر آمادہ کرتی ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا کہنا ہے کہ:

> ''''قاہرہ کی پہلی نظم'' جو خود اس مجموعے کی پہلی نظم بھی ہے، اپنے عنوان سے اپنے موضوع کا کچھ سراغ نہیں دیتی۔پہلی اور پھر دوسری خواندگی میں اس کے پرت آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔یہ نظم سیرتِ مطہرہ کے ایک مخصوص پہلو کو روایتِ محض کی حدود سے آگے لے کر شدتِ احساس کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

وسیلے سے قاری پر طاری کرتی ہے اور نظم کی قرأت کو ایک کیفیت اور قلبی واردات کی سطح تک پہنچا دیتی ہے۔'' ۶

کائنات، انسان اور دیگر مظاہر فطرت آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے مل کر تشکیل پاتے ہیں لیکن اوّل وثانی الذکر کا وجود بالخصوص پانی سے نمو پاتا ہے اور پانی کے بلبلے کی مانند فنا کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ نظم ''ایکویریم'' ایسے ہی علامتی پیرایہ اظہار کے ذریعے عقل و فکر رکھنے والوں کو جہاں واپسی کا سفر یاد دلاتی ہے وہاں حیاتِ چند روزہ میں عہد الست کی تکمیل کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ نظم کی کچھ سطور ملاحظہ ہوں:

میں پانی میں تھا
اور پانی سے میرا بدن بن رہا تھا
میں پانی میں ہوں اور کچھ بلبلے میرے جینے کا سامان ہیں
میں خود آبلہ ہوں
مجھے ٹھیس پہنچے ذرا سی بھی کوئی
مرے روز و شب ریزہ ریزہ بکھر جائیں گے
اور میں پھر سے پانی میں بہنے لگوں گا ۷

فنا کی کہانی اگرچہ نئی نہیں ہے لیکن دنیا کی خوب صورتی اور خواہشوں میں الجھے ہوئے انسانوں کی توجہ اس کہانی سے اکثر پھسل کر حاضر و موجود کی ضرورتوں میں گم ہو کر اپنے مقصد سے ہٹ جاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انسان کو درپیش تمام المیوں سے بڑا المیہ فنا ہی ہے۔ ایکویریم ایسے ہی المیے کا علامتی اظہار ہے۔ اسی نظم کے ضمن میں جمیل یوسف کا کہنا ہے کہ:

'زاہد منیر عامر کی نظمیں عصر حاضر کے انسانوں کے شعور و احساس کا آئینہ ہیں جس میں اس کی روز مرہ زندگی کے شب و روز جھلکتے ہیں۔ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں اسے اپنے وجود کی بے بسی اور فنا پذیری کا احساس ستاتا ہے۔ اس کا خوبصورت شاعرانہ اظہار 'ایکویریم'' میں ملتا ہے۔'' ۸

اسی نظم کے باب میں ڈاکٹر سعادت سعید کہتے ہیں کہ:

''زاہد منیر عامر نے ایک حساس شاعر کی مانند ایکویریم میں قید سمندری حیات کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسے اپنی حیات کے قید خانے سے ملا دیا ہے۔ اس وجودی رویے سے ان کی نظموں کے استعاراتی معنی توسیع پاتے ہیں۔'' ۹

انسان جتنی بے اعتنائی کا مظاہرہ کر کے اپنے ماحول اور ارد گرد سے لاتعلق ہو جائے پھر بھی وہ اپنے ماحول اور ان سے منسلک افراد و اشیاء سے لاتعلق نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ فاصلے بتاتے ہیں رشتہ کتنا گہرا ہے؟ ساتھ کھانے پینے کو دوستی نہیں کہتے۔ کبھی یہ بات بھی بلاخوف تردید کہہ دی جاتی ہے کہ جتنے لوگ دل کے قریب ہوتے ہیں، وہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

اتنے ہی بلاک لسٹ میں پائے جاتے ہیں۔ ''آنکھوں میں چھپے موتی، مٹھیوں میں بند خواب، چلو تصویر سے پوچھیں، ریت پر نام لکھا، یہی پرواز جس کا مجھے ڈر ہے، شمسیہ، کون ہے؟، ڈال سے کوئل اڑ جاتی ہے، سینے میں سانس لیتی کرن، تمہارے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں، رُکو' دیکھو' لہروں کی ملاقاتیں، ایک نظم'' وغیرہ میں ناتمام آرزوؤں، عذابِ تنہائی، زندگی کی تلخیوں، افراد کی لاتعلقی و بے اعتنائی کے المیے اور ان کی بازگشت کو بہ خوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وقت کا دھارا اپنے انداز سے زندگی کے شب و روز کو ترتیب دیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان جس طرح سوچتا ہو زندگی کی خواہشیں ویسے ہی پوری ہو جائیں۔ ابھی توقعات کے پورے نہ ہونے، اُنھی خواہشات کے ناتمام ہونے اور دل کی باتیں دل میں رہ جانے سے دل سے امید، دماغ سے سوچ اور آنکھوں سے روشنی سلب ہو جاتی ہے اور انسان قنوطیت کے راستوں کا مسافر بن جاتا ہے لیکن ان تمام تر المیوں کے باوجود ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی انفرادیت اور تخصص یہی ہے کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قارئین بھی ان کی نظموں سے رجائیت پسندی کے عناصر کشید کرتے ہوئے ہر حالت میں زندگی کو پامردی سے بسر کرنے کا درس لیتے ہیں۔ ان کی نظم ''صدیوں کے پیچاک میں دمکتا ستارہ'' سے میری متذکرہ بالا بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

''سمے کا پارکھ، کرن، خاک اور خواب اور سروش'' کے لیے نظموں کے موضوعات، ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر چودھری عبدالحمید اور ان کے اپنے بیٹے سے متعلق ہیں۔ وہ جہاں خورشید رضوی کی شاعری کے مداح ہیں بل کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ دیدۂ بینا عطا کر رکھی ہے جس کے ذریعے وہ صدیوں کے پار دیکھنے کی صلاحیت سے ثروت مند ہوتا ہے اور اس کا اظہار اپنی شاعری میں سمو کر وہ اسے الہامی و وجدانی قرار دیتے ہوئے الشعراء تلمیذ الرحمن کی تائید کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شاگرد اپنے اساتذہ کا ایک خوب صورت عکس ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اساتذہ کی ترقی اُن کے تلامذہ کا علم و فضل اور مرتبے میں اُن سے آگے بڑھ جانا ہے لیکن شاگرد اپنے اساتذہ کی بے پناہ محبتوں، غیر مشروط عنایتوں اور خلوص کے معترف ہونے کے ساتھ اُن کے لیے زندگی کی آخری سانس تک دست بہ دعا رہتے ہیں۔ جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں کے روپ میں ڈھل کر کیوں نہ پھر سے جوان ہو جائیں۔ نظم ''سروش'' اسی بھرپور تاثر کی حامل ہے۔ والدین کی لامحدود محبتوں کی پیمائش کے لیے ابھی تک کوئی پیمانہ وجود میں نہیں آیا۔ اگر اس کا وجود منصہ شہود پر آبھی گیا تو پھر بھی وہ آلہ بے نیلِ مرام ہی رہے گا۔ کتاب کے دوسرے حصے میں شامل منظومات کی تعداد بھی بیس ہے جو رومانوی تاثر سے لبریز ہیں۔ اس حصے میں شامل نظموں کے عناوین بھی اس نظریے کو مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

محبت کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب آسانی سے میسر نہیں آتا کیوں کہ ہر شخص اپنے ماحول، حالات و واقعات اور تعلیم و تربیت کے تناظر میں اس کی تعریفیں وضع کرنے کا قائل ہے۔ کہیں اس کا تعلق دل سے جوڑا جاتا ہے تو کہیں اسے دماغی کارستانی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک محبت ہارمونل تبدیلیوں کا نام ہے۔ دل نظامِ دورانِ خون میں اپنا اہم کردار نبھاتا ہے لہٰذا دل سے منسلک جملہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ محبت کو فن کا درجہ دیتے ہیں اور وہ اسے سیکھنے پر نہ صرف توجہ دینے کے قائل ہیں بل کہ وہ اس کی مشق پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایرک فرام کا کہنا ہے کہ:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

"کیا محبت ایک فن ہے؟ جیسے زندہ رہنا ایک فن ہے! کیا محبت کو بھی دیگر فنون کی طرح سیکھا جا سکتا ہے؟ جیسے موسیقی، خطاطی وغیرہ سیکھی جاسکتی ہے! کسی بھی فن کو سیکھنے کے لیے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے نظریات پر عبور اور پھر اس کی مشق پر مہارت کا حصول۔ اگر مجھے ادویات سازی کا فن سیکھنا ہے تو پہلے مجھے انسانی جسم اور بیماریوں کے متعلق حقائق حاصل کرنے ہوں گے۔ جب میں تمام کتابی علم حاصل کرلوں گا تو بلاشبہ میں فن کو بروئے کار لانے کے قابل ہو جاؤں گا مگر فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مجھے عرصہ دراز کی مشق چاہیے حتیٰ کہ میرا علم اور مشق ایک ہو جائیں تب میری باطنی دانش اس فن میں مہارت کا نچوڑ ہو گی۔۔۔۔ مگر کوئی بھی محبت کا فن سیکھنے میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رکھتا۔" ۱۰

محبت کا آغاز دیکھنے سے ہوتا ہے۔ پھر دوبارہ دیکھنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔ قربت کی آرزو، محبت کے اظہار کے لیے آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ اگر دوسری طرف سے بھی مثبت اظہار ہو جائے تو محبت دو طرفہ ہوتی ہے۔ اگر انکار ہو جائے تو یک طرفہ کہلاتی ہے جس میں پہلے انسان کا دنیا سے جی اکتاتا ہے اور اس سے اگلے مرحلے میں وہ زندگی سے بھی دست کش ہو جاتا ہے۔ دو طرفہ محبت میں ایک دوسرے کی پسندیدگی پر ہر حالت میں قائم رہنے کو "وفا" کہتے ہیں۔ چاہے گھریلو، معاشرتی یا اخلاقی دباؤ کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے یہاں تک کہ جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں؟ ان سب کے باوجود اپنی بات پر قائم رہنے والا باوفا اور حالات وواقعات کے پیش نظر مصلحت کا دامن تھام کر پیچھے ہٹنے والا بے وفا نام پاتا ہے۔ جس کے ساتھ بے وفائی ہوئی ہو وہ بھی پہلے زندگی اور پھر دنیا سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ شرط اس بات کی ہے کہ وہ محبت کے جذبوں میں صادق ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو زندگی، موت، غم، خوشی، اپنے اور پرائے کی معنویت سے آشنا کرتی ہے۔ مزید برآں غمِ جاناں سے غمِ جہاں کی دہلیز تک لے آتی ہے۔

اس حصے کی نظموں میں مجھے محولہ بالا سبھی جذبوں کی جھلک نظر آئی ہے جس نے مجھے بے ساختہ اس کتاب کو پڑھنے پر آمادہ کیا اور میں ایک نشست میں نہ صرف اسے پڑھنے بل کہ ان جذبوں نے ہی مجھے اس پر اظہارِ خیال کو مہمیز عطا کی۔ "محبت امتحان ہے" یہ نظم ان کسمساتے جذبوں کی امیں ہے جن سے جذبوں اور موسموں میں بہار کے رنگ کھلتے ہیں۔ "محبت آزمائیں گے" محبت کی لگن سے سرشار اور عزائم سے معمور نظم ہے جس سے غم کی حدت اور تلخی کی آنچ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ "اُداسی کو بہانہ مل گیا" بے چین طبیعت لمحہ بھر کے لیے مناظر فطرت اور ارد گرد کے ماحول میں پناہ لیتی ہے تو اس غم کی شدت سے لمحہ بھر کے لیے سکھ کا سانس لینا میسر آتا ہے لیکن یہ وقفہ عارضی ثابت ہوتا ہے۔ یہ غم ایسا غم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ انسان پھر اسی میں جا کر پناہ لے لیتا ہے۔ "ستارے میرے مونس ہیں" ایک حساس شاعر بے حس دنیا سے کٹ کر اپنا ناتا فطرت سے استوار کر لیتا ہے تو عناصر فطرت اسے اپنے ہم درد اور غم گُسار لگتے ہیں۔ "کہاں ہو تم" اگرچہ بساطِ جان اُلٹ جاتی ہے لیکن شاعر تخیل کے اسی لمحے میں موجود ہوتا ہے جہاں محبت نے ہجر کے لمس کو محسوس نہیں کیا ہوتا۔ وہ بقول بہزاد لکھنوی بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

؎ کہاں ہو تم چلے آؤ، محبت کا تقاضا ہے
غمِ دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے
نجانے کس لیے دنیا کی نظریں پھر گئی ہم سے
تمہیں دیکھا، تمہیں چاہا، قصور اس کے سوا کیا ہے [11]

''حقیقت واہمہ ہے'' اس نظم میں اشارہ اُس رویے کی طرف ہے کہ جس کے تحت زندگی اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ بعض خوش نما نظارے انسان کے وہم و گمان میں کچھ اس طرح چھا جاتے ہیں کہ انسان ان میں رہنا پسند کرتا ہے لیکن وقت زندگی کی لگامیں تھام کر اسے آگے ہی آگے دھکیلتا چلا جاتا ہے جہاں انسان ریت گھڑی کی ریت کی صورت پھسلتا ہوا اپنے سفر کا دائرہ مکمل کرتا ہے لیکن اس کی نظریں خوش نما مناظر کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ ''محبت پھول ہے لیکن'' محبت آغاز سے انجام تک لاتعداد آزمائشوں اور امتحانوں سے بھری ہوتی ہے۔ جس طرح پھول کا بکھرنا اس کی زندگی کو مکمل کرتا ہے اس لیے بعض اوقات محبت بھی فنا کی زد میں آکر تکمیل پاتی ہے۔ یہ نظم اسی المیے کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کروانے کا باعث ہے۔ ''دعا'' محبت سچی ہو تو ہونٹوں پر دعاؤں کے کنول کھلتے ہیں ورنہ بوالہوس حسد سے ہلکان ہو کر یا تو محب کی زندگی اجیرن کرنے کا باعث بنتے ہیں یا پھر اس کی زندگی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خود کسی نئی منزل کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں لیکن جو ان جذبوں میں صادق ہوں ان کی منزل ایک ہی ہوتی ہے چاہے وہ انھیں میسر آئے یا نہ آئے۔ وہ ہر صورت میں ان کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ بقول عباس تابش:

؎ ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہیں
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں [12]

اس حصے کی بقیہ نظموں میں بھی محبت کی واردات کے دوسرے رنگ ڈھنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں شامل نظموں کی تعداد دس ہے جو مختلف ملکوں اور ان کے شہروں سے متعلق اشعار کا خوب صورت بیانیہ ہے۔ ان ملکوں میں ترکی کے دو شہر استنبول اور قونیہ، اٹلی اور اس کا شہر نیپلز، ایران، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، یورپ اور یونان شامل ہیں۔ مصر کے شہر ''قاہرہ'' سے متعلق نظم جس کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا کہنا ہے کہ وہ سیرتِ مطہرہ سے متعلق ہے اس لیے وُہ پہلے حصے کی ابتدائی نظم کا ہے۔ حساس شاعر نے ان ملکوں کی سیر کرتے ہوئے جو محسوس کیا ہے انھیں جذبوں کی صداقت کے ساتھ اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے قارئین بے ساختہ شاعر کے مشاہدہ کی داد دیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ اگر آپ نے ان ممالک کی سیر کر رکھی ہے یا کسی نہ کسی طرح ان کے خوب صورت مناظر سے واقف ہیں تو یہی نظمیں شاہ کار کا درجہ اختیار کر کے ذہن و وجدان میں دل کش و دل فریب مناظر کی عکس کشی کا باعث بھی بن جانے کی خوبی سے متصف ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.1 2022

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی نظموں میں انفرادیت اور اسلوب میں وہ دل کشی موجود ہے جس نے تمام نظموں کو نہ صرف پڑھنے پر آمادہ کیا بل کہ ان کے موضوعات کے تنوع نے اوّل سے آخر تک کہیں بے زاری اور اکتاہٹ کو قریب نہیں آنے دیا۔ان نظموں میں آخر کیا ہے جس نے اپنی گرفت میں لے لیا اور تب تک آزاد نہیں ہونے دیا جب تک کتاب کا اختتامیہ نہیں آگیا۔ کچھ لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھ جو لگ جائے وہ اسے فوراً پڑھ لیتے ہیں۔ کتاب میلہ سے کتابیں تو خریدی جاتی ہیں لیکن اپنے ذوق وشوق اور دل چسپی کی کتابوں کی ایک ترتیب بنتی ہے تب اُنھیں پڑھنے کا موقع آتا ہے اور اسی اثناء میں ایک سال کے وقفہ سے منعقد ہونے والا کتاب میلہ پھر آچکا ہوتا ہے اور ابھی کئی کتابیں پڑھنا باقی ہوتی ہیں۔ یہ بات مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں بل کہ حقیقت ہے۔ جن لوگوں کو شاعری کا ذوق ہے وہ لوگ اس کتاب کی خواندگی سے ان نظموں میں موجود خوبیوں کا ادراک کرنت کے قابل ہو سکیں گے۔ایسی نظم کہ جب انسان سوشل میڈیا کے دیگر ذرائع کے ہاتھوں شاعری، کتاب اور فنونِ لطیفہ کی جملہ اصناف سے دوری اختیار کرنے کا عادی ہو وہ ان سے بے نیاز ہو کر جہاں اس کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دے اور مکمل کر کے سکھ کا سانس لے۔ایسی نظم کی اہمیت سے کوئی بھی صاحبِ ذوق انکار نہ کر سکے گا اور ”آتے دنوں میں گم“ امکانات کے واضح ہو جانے سے ایک زمانہ شاعر اور ان کی شاعری کا معترف ہو گا۔

حوالہ جات

۱۔ افتخار عارف، بیک فلیپ مشمولہ آتے دنوں میں گم از زاہد منیر عامر، لاہور: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۲۱ء

۲۔ سعود عثمانی، قوس، لاہور: کُتب نما پبلشرز، بک سیلرز، جولائی ۱۹۹۷ء، ص۳۸

۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص۶۹۔۷۰

۴۔ سعود عثمانی، قوس، ص۱۲۶

۵۔ وزیر آغا، تخلیقی عمل، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، مارچ ۲۰۱۰ء، ص۲۹

۶۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، پیشِ سخن (دیباچہ)، آتے دنوں میں گم از زاہد منیر عامر، ص۱۵

۷۔ زاہد منیر عامر، آتے دنوں میں گم، ص۲۹

۸۔ ایضاً، ص۱۲۹

۹۔ ایضاً، ص۱۴۸

۱۰۔ نمر احمد مترجم: فنِ محبت از ایرک فرام، لاہور: نگارشات، ۲۰۱۶ء، ص۱۱

۱۱۔ www.urduweb.org

۱۲۔ عباس تابش، عشق آباد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص۴۰۲